محمد جلال الدین رومی: ایک آفاقی شاعر

ڈاکٹر صدیقہ سادات رجایی زادہ
Dr. Siddiqa Sadat Rajaei Zadeh

Abstract:

"Jalal ud din Roomi was the prominent Sufi poet of 13th century. He presented Quranic thoughts in his poems. Mysticism is the basic theme of his poetry. "Masnavi Mani" is his famous poem which influence the poetry of whole world. This is translated in many languages of the world. He used fables and myths to preach the ethics. In this article ,universality of his poetry is focused."

تاریخ تصوف اسلام میں محمد جلال الدین رومی ایک بڑی شخصیت کے مالک ہیں جو اپنی فکر و شاعری کو انسان کی تعلیم و تربیت میں صرف کرتے رہے ہیں۔ رومی تیرھویں صدی کے ایران کے ایک ممتاز صوفی شاعر ہیں۔ انہوں نے نظم و نثر میں قرآنی رموز کو زبان فارسی میں پیش کیا ہے۔ ان کی شاعری کا موضوع بہت وسیع ہے۔ مولانا روم نے اپنے خیالات میں حقائق دین اور زندگی کی روح کو سمو دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے زمانے کے علاوہ آج بھی ان کے اشعار مشہور اور مقبول ہیں۔ ان کی صوفیانہ مثنوی دنیا کی عظیم شاعری میں شمار کی جاتی ہے چنانچہ صدیاں گزر جانے کے بعد بھی ان کی مثنوی معنوی آج بھی ''قرآن در زبان پہلوی'' کا درجہ رکھتی ہے۔ رومی صرف فرد اور معاشرے کی اصلاح و ترقی کے مبلغ نہیں بلکہ ارتقائے انسانی کے علمبردار ہیں اور فکر و عمل کا باہمی رشتہ استوار کرنا چاہتے ہیں۔ رومی کے افکار اور خیالات کی معنویت سے مکمل طور پر واقف ہونے کے لیے ان کے دور کے فکری اور تہذیبی حالات سے بھی آگہی ضروری ہے۔

مولانا روم کے عہد کے معاشرتی اور تہذیبی حالات

مولانا روم کی حیات تیرہویں صدی عیسوی (ساتویں صدی ہجری) کو محیط ہے۔ اس دور میں رومی کا عہد غیر معمولی طور پر، پُرآشوب تھا۔ اسلام مختلف فرقوں میں تقسیم ہو چکا تھا اور ملتِ اسلامیہ اندرونی فتنوں اور بیرونی حملوں کی وجہ سے تباہی تک آ پہنچی تھی۔ اس زمانے میں اسلامی سلطنت کو دو خطرناک دُشمنوں کا سامنا تھا اور ان سے اسلام کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ مغرب کی طرف سے صلیبی یورش کا خطرہ تھا۔ اس

☆ اُستاذِ اُردو، اصفہان، ایران

دور میں صلیبی جنگوں کی تاریخ سے یہ حقیقت عیاں ہوجاتی ہے کہ یورپ اسلام کو کمزور کرنا چاہتا تھا۔ عیسائیوں کی کوشش تھی کہ ہر طریقے سے اپنے اختلافات دور کرلیں تاکہ مسلمانوں پر غلبہ پایا جاسکے۔ دوسری طرف سے مسلمانوں کا ایک اور دشمن منگول سلطنت تھا۔ اس سلطنت کا بانی چنگیز خان تھا جو نہ اسلام کا حمایتی تھا نہ عیسائیت کا۔ اس نے اپنی ایک تقریر میں کہا تھا کہ:

''من عذاب خداام اگر شما گناھہای بزرگ نکردتی خدای چون من عذاب را بسر شما نفرستادی''(۱)

(میں خدا کا وہ تازیانہ ہوں جو لوگوں کے گناہوں کی سزا کے لیے اس دنیا میں بھیجا گیا)

سترھویں صدی ہجری میں منگولوں کے حملے کی وجہ سے نہ صرف عالم اسلام بلائے عظیم میں مبتلا تھا، بلکہ پوری دنیا منگولوں کی یورش سے خوف زدہ تھی۔ اس یورش کا سبب ایران کے سلطان وقت علاء الدین محمد خوارزم شاہ کی ایک بے تدبیری تھی۔ اس نے ان منگول تاجروں کو جو ایران میں تجارت کی غرض سے آئے تھے قتل کروادیا تھا۔ جب چنگیز خان نے اس قتل کی وجہ معلوم کرنے کے لیے ایک سفیر بھیجا تو خوارزم شاہ نے اس سفیر کو بھی قتل کروادیا۔ اس غلطی کی وجہ سے چنگیز خان نے ناراض ہوکر خوارزم شاہ اور پورے عالم اسلام کے خلاف اعلان جنگ کردیا۔ اس سلسلے میں محمد عبدالسلام لکھتے ہیں:

''یہ مقامی اور جابجا کی تباہیاں کیا کم تھیں کہ سب سے بڑے اور دوررَس فتنے تاتاری یلغار نے قریب قریب پوری مسلم دنیا کو سیلاب کی طرح آلیا۔ تاتاری یورش نے لگ بھگ سارے اہم مسلم مقبوضات کو پامال کردیا۔ ہزاروں شہر اجاڑ دیے گئے۔ علوم وفنون کے بڑے بڑے مراکز ویران ہوگئے۔ جن بستیوں میں علماء وفضلاء کا مجمع تھا اور تشنگانِ علوم کارواں در کارواں دن رات اترتے تھے، وہ سب بے چراغ ہوگئیں۔ بخارا خاک کا ڈھیر ہو گیا۔ ساری آبادی تہہ تیغ کردی گئی سمرقند جل کر راکھ ہوگیا۔ باشندے قتل ہوگئے، بلخ، رے، ہمدان، زنجان، قزوین، مرو، نیشاپور اور خوارزم جیسے عالم اسلامی کی پیشانی کے چمکتے ستارے ٹوٹ کر مٹی میں مل گئے۔ عروس البلاد بغداد دنیائے اسلام کا جگمگاتا تاج ہلاکو کی وحشی اور خونخوار فوجوں کے ہاتھوں تاراج ہوگیا۔ اور مسلم تہذیب وتمدن کی وہ یادگار جو صدیوں میں بنتے بنتے بنی تھی، اچانک گرد وغبار کی طرح اڑ گئی۔ سیکڑوں سال تک جمع ہوتا رہنے والا علوم وفنون کا نادر خزانہ چالیس دن میں خاکستر ہوگیا۔ خلافت عباسیہ کا تنہا وارث خلیفہ معتصم باللہ دنیا بھر کے مسلمانوں کی آبرو تھا اور صدہا مسلم اقتدار کی صرف روحانی علامت بن چکا تھا، خیمے میں لپیٹ کر پاؤں سے روندوا دیا گیا۔''(۲)

اس پُرآشوب دور میں منگولوں کی ہیبت کا یہ عالم تھا کہ بعض اوقات فقط ایک منگول کسی گلی میں گھس جاتا تو اگر سو مسلمان بھی موجود ہوتے تو کسی کو مقابلے کی ہمت نہ ہوتی سارے مسلمان حیران و

پریشان تھے۔ منگولوں کا مقابلہ کرنا ناممکن تھا، لوگ ان کو نا قابل شکست سمجھتے تھے۔ منگولوں کا فتنہ نہ صرف ایران میں ظاہر ہوا بلکہ اس نے ایشیا اور یورپ کے ایک بڑے حصہ کو ویران کر دیا۔ اس قتل وغارت گری کا اثر سب سے زیادہ ادبیات اور علوم پر پڑا۔ مساجد، مدارس اور کتب خانے جن میں علوم وآثار کے بے شمار خزانے تھے برباد ہو گئے۔ چنگیز خان کی یورش سے پہلے ایران کا شہر بلخ مختلف علوم وفنون اور تہذیب وتمدن کا گہوارہ تھا اور علم وادب کا مرکز بن چکا تھا۔ ۶۰۳ ہجری (مطابق ۱۲۰۶ء) میں خوارزم شاہ نے بلخ پر قبضہ کر لیا۔ اس دور میں بھی درس وتدریس کا سلسلہ جاری رہا مگر بروایت متفقہ بلخ کو بھی چنگیز خان نے ۶۱۷ھ میں تباہ کیا۔ (۳)

نتیجتاً اس صدی کے اختتام تک ایران اخلاقی، معاشی اور معاشرتی لحاظ سے بالکل تباہ ہو چکا تھا۔ ان سب کے باوجود عجیب بات یہ ہے کہ منگول قوم نے عالم اسلام کے خلاف اعلان جنگ کر دیا کے بعد اپنے انتہائی عروج کے زمانے میں مسلمانوں کے دین کی طرف مائل ہوئی اور منگولوں میں بھی اسلام پھیلنے لگا۔ دراصل یہ صورت چنگیز خان کے انتقال کے بعد پیش آئی۔ اس کے چار بیٹوں کی الگ الگ سلطنتوں میں اسلام کی اشاعت شروع ہوئی۔ یہاں تک کہ ایک صدی کے اندر تقریباً ساری منگول قوم مسلمان ہو گئی۔

مولانا روم کا خاندانی شجرہ

تذکرہ نویسوں کے مطابق مولانا روم کے آباء واجداد شہر بلخ کے رہنے والے تھے۔ اس خاندان کا شجرۂ نسب، حضرت ابوبکر صدیق سے ملتا ہے۔ اس سلسلے میں خود رومی کے بیٹے سلطان ولد کا قول زیادہ معتبر ہے:

اصل او در نسب ابوبکرے
زاں چو صدیق داشت او صدرے

رومی کے دادا جلال الدین حسین خطیبی ایک بڑے فاضل شخص تھے اور معاشرے میں ان کا مرتبہ بہت بلند تھا۔ افلاکی اور دوسرے تذکرہ نویسوں کے مطابق جلال الدین حسین خطیبی کا عقد خاندان خوارزم شاہی کی شہزادی ملکہ جہاں سے ہوا تھا۔ ملکہ جہاں کے بطن سے ''سلطان بہاء الدین ولد'' یعنی مولانا کے والد پیدا ہوئے۔ بہاء الدین اپنے والد کی علم وفضل کے وارث تھے۔ وہ نوعمر ہی میں اس دور کے تمام علوم میں ماہر ہو گئے تھے اور روحانی بزرگی کے سبب معاشرے میں ان کا بڑا احترام کیا جاتا تھا۔ اس عرصے میں بہاء الدین ولد کو ''سلطان العلماء'' کے خطاب سے نوازا گیا۔ مختلف تذکرہ نویسوں نے خطاب ملنے کی تفصیلات لکھی ہیں کہ:

ایک رات بلخ کے تین سو مفتیوں نے بہ یک وقت یہ خواب دیکھا کہ ایک میدان میں ایک بڑا خیمہ نصب ہے اور آنحضرت ﷺ اس خیمہ میں رونق افروز ہیں۔ بہاء الدین آپ کے پہلو میں اور دوسرے بہت سے علما آنحضرت سے فاصلہ پر بیٹھے ہیں۔ آنحضرت نے فرمایا کہ آپ سبھی لوگ آج سے بہاء

الدین ولد کو ''سلطان العلماء'' کہیں۔ صبح کو یہ اصحاب اس غرض سے بہاء الدین ولد کے پاس گئے کہ انہیں اس واقعہ سے آگاہ کریں۔ راستہ میں جو بھی ملتا وہ اپنا خواب بیان کرتا اور لوگوں کی حیرت بڑھتی جاتی۔ جب بہاء الدین ولد کی خدمت میں پہنچے تو انہوں نے فرمایا کہ جب تک حضور نے تم کو مطلع نہ فرمایا تم کو یقین نہ آیا۔

(تا حضرت پیغامبر علیہ السلام از حال درویشان اعلام نفرمود شمارا یقین نگشت۔)[۴]

پھر تو سب ایک ساتھ مرید ہو گئے اور اس کے بعد سے حضرت بہاء الدین اپنے نام کے بجائے ''سلطان العلماء'' کے لقب سے مشہور ہو گئے۔ اس واقعہ کو سلطان ولد نے اپنی مثنوی ولدنامہ میں، سپہ سالار نے اپنے رسالے میں اور افلاکی نے مناقب العارفین میں لکھا ہے۔

محمد جلال الدین رومی کی پیدائش اور ابتدائی زندگی

سلطان العلماء کے فرزند محمد جلال الدین ۶ ربیع الاول ۶۰۴ھ (مطابق ۳۰ ستمبر ۱۲۰۷) میں بلخ میں پیدا ہوئے۔[۵] تذکروں کے مطابق رومی بچپن میں بہت ذہین اور سریع الفہم تھے۔ وہ بچپن ہی سے روحانی قوتوں کے حامل بن چکے تھے۔ رومی کے گھر کا ماحول عالمانہ اور صوفیانہ تھا۔ ان کے والد بہاء الدین ولد، ان کے دادا جلال الدین حسین خطیبی اور ان کے استاد برہان الدین محقق ترمذی سب اعلیٰ پایہ کے صوفی بزرگ تھے۔ اسی صوفیانہ ماحول میں رومی کی پرورش ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے مراحل ان کے والد نے طے کرادیئے اور پھر انہوں نے اپنے ایک مرید خاص یعنی سید برہان الدین محقق ترمذی کو رومی کا استاد مقرر کر دیا۔ چار پانچ سال تک رومی انہیں کے زیر تربیت رہے۔ اس کے بعد منگول قوم کی یورش سے پہلے بہاء الدین نے اپنے خاندان اور شاگردوں کے ساتھ بلخ سے ہجرت کی۔[۶] تاریخی شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ بلخ میں جب بہاء الدین ولد کا اثر خواص وعوام میں بڑھنے لگا اور ان کے مریدوں کی تعداد بے شمار ہو گئی تو بعض علماء کو رشک ہونے لگا اور ان لوگوں کی بدگوئی کی وجہ سے خوارزم شاہ بھی بہاء الدین سے بدگمان ہو گیا، اس لیے وہ ترکِ وطن کر بلخ سے بغداد کی طرف روانہ ہو گئے۔ جب وہ نیشاپور پہنچے تو وہاں فرید الدین عطار نیشاپوری سے ملاقات ہوئی۔ عطار نے رومی کو دیکھ کر ان کی عظمت کی پیش گوئی کر دی اور اپنی کتاب ''اسرارنامہ'' ان کو عنایت کی۔ اس وقت رومی کی عمر فقط چودہ سال تھی۔[۷]

نیشاپور کے بعد بغداد، مکہ، دمشق اور مختلف شہروں سے گزر کر وہ ملاطیہ پہنچے۔ آقشہر میں انہوں نے چار سال قیام کیا اور درس وتدریس میں مشغول رہے۔ آقشہر کے بعد وہ قونیہ کے ایک شہر لارندہ تشریف لائے۔ یہاں سلطان العلماء کی ملاقات اور دوستی سمرقند کے ایک معزّز بزرگ شیخ خواجہ شرف الدین سمرقندی سے ہوئی۔ ان کی ایک بیٹی، گوہر خاتون تھیں جو نہایت نیک اور باکمال تھیں۔ سلطان العلماء کی درخواست پر خواجہ شرف الدین نے اپنی بیٹی کا عقد رومی سے کر دیا جن کی عمر اس وقت اٹھارہ برس کی

تھی۔[۸] در اصل رومی کی دو شادیاں ہوئیں۔ پہلی بیوی گوہر خاتون تھیں۔ ان کے بطن سے تین صاحبزادے بہاء الدین محمد سلطان ولد، علاء الدین محمد اور مظفر الدین پیدا ہوئے۔ گوہر خاتون کی وفات کے بعد رومی کا عقد کرّا خاتون قونوی کے ساتھ ہوا۔ ان کے بطن سے ایک صاحبزادی ملکہ خاتون پیدا ہوئیں۔ ان میں بہاء الدین ولد سب سے بڑے تھے جو رومی کے بعد اپنے والد کے جانشین ہوئے۔ سلطان ولد نے ایک مثنوی ''ولد نامہ'' کے نام سے لکھی تھی جس کے اشعار مختلف تذکروں میں نقل ہوئے ہیں۔ مولانا کے دوسرے صاحبزادے یعنی علاء الدین کے متعلق افلاکی لکھتے ہیں کہ وہ شمس تبریز کے قتل میں شریک ہو گیا تھا جس کی وجہ سے رومی اس سے بیزار ہو گئے تھے۔

''در قصد مولانا شمس الدین تبریزی روح اللہ مبادرت کردتا ہمرنگ مریدان مرتد گشت و گویند اوراایشاں اغوا کردہ بودند و برآن داشتہ بودند''[۹]

لیکن افلاکی کی یہ بات بعید از قیاس معلوم ہوتی ہے کہ ایسے محترم خاندان کا کوئی فرد قتل کا ارتکاب کر سکتا ہے۔

سنہ ۶۲۶ ھ میں شمس العلماء، سلطان روم یعنی علاء الدین کیقباد کی خواہش پر قونیہ چلے گئے۔ سلطان نے خود بڑی فروتنی سے استقبال کیا۔ سلطان العلماء نے وہاں کے ایک مدرسہ میں قیام کیا۔[۱۰]

اس مدت میں رومی ہمیشہ اپنے والد کے ساتھ رہے اور علوم ظاہری و باطنی ان سے حاصل کرتے رہے۔ سلطان العلماء کو بھی اپنے بیٹے سے بہت محبت تھی وہ ایک جگہ کہتے ہیں:

''در میدان معنی تا زندہ ام کسی ہمچو من پیدا نیاید، باش تا من بگذرم تا بہ بینی کہ فرزندم جلال الدین محمد چون شود بجای من شود و بالاتر از من شود۔''[۱۱]

(جب تک میں زندہ ہوں کوئی میرا مثل پیدا نہیں ہوگا۔ ذرا انتظار کرو کہ میں گزر جاؤں پھر دیکھنا کہ میرا فرزند جلال الدین محمد کیا ہوتا ہے۔ وہ میری جگہ پر ہوگا بلکہ مجھ سے بھی بالاتر ہوگا۔)

رومی کی تعلیم

قیامِ قونیہ کے دو سال بعد یعنی ۶۲۸ ھ (مطابق ۱۲۳۱ء) میں شمس العلما کا انتقال ہوا۔[۱۲] ان کے انتقال کے بعد سلطان وقت اور اکابرین کی درخواست پر رومی اپنے والد کے جانشین ہوئے اور ان کے سلسلہ درس و تدریس کو جاری رکھا۔ اس وقت وہ چوبیس برس کے تھے۔ رومی کے استاد برہان الدین ترمذی شمس العلماء کے انتقال کی خبر سن کر قونیہ آئے اور اپنے شاگرد کو باطنی علوم کی طرف منتقل کرنا چاہا جو انہوں نے اپنے مرشد یعنی رومی کے والد سے حاصل کئے تھے۔ تحصیل و تربیت کا یہ سلسلہ نو برس تک جاری رہا۔[۱۳] رومی اگر چہ چوبیس برس کی عمر میں اپنے والد کے جانشین ہو گئے تھے لیکن ابھی مزید تعلیم و تربیت کی ضرورت تھی تا کہ وہ صحیح معنوں میں اپنے والد کے جانشین بن سکیں۔ برہان الدین یہ چاہتے تھے کہ ان کے شاگرد ظاہری و باطنی طور پر اپنے والد کے صحیح جانشین ثابت ہوں اس لیے رومی مزید تعلیم کے لیے حلب

کے مدرسہ حلاویہ میں داخل ہو گئے۔

تیرہویں صدی میں حلب اور دمشق اسلامی علوم کے اہم ترین مراکز تھے۔ یہ دونوں مقام منگول قوم کے حملوں سے محفوظ تھے اور علماء و اکابر کے لیے ایک پرسکون شہر تھے۔ ۶۳۰ھ میں جب رومی مدرسہ حلاویہ میں داخل ہوئے تو اس وقت ''کمال الدین ابن العدیم'' اس مدرسہ کے نگراں تھے۔ ایک عالم اور شاعر کے طور پر ان کی بڑی شہرت تھی۔ افلاکی نے انہیں فاضل زمانہ اور صوفی روشن ضمیر کہا ہے۔ یہاں اسی عالم سے رومی کا رابطہ قائم ہوا اور انہوں نے فقہ اور مذہب کی تعلیم کمال الدین سے حاصل کی۔ حلب کے بعد رومی دمشق روانہ ہو گئے جہاں وہ چار سال مقیم رہے۔ اس کے بعد وہ قونیہ واپس آ گئے۔ اب چونتیس برس کی عمر میں رومی ایک بڑے استاد اور رہنما بن چکے تھے اور بڑے بڑے مجمعوں میں مذہب، فلسفہ، فقہ اور اخلاقیات پر تقریریں کرتے تھے۔ ان کے مریدوں کا حلقہ بہت وسیع ہو چکا تھا۔ اکثر تذکروں کے مطابق مولانا اپنے زمانے کے بہت سے مشاہیر سے ملے لیکن اس کی تفصیلات دستیاب نہیں۔ ان کے بعض احباب کے نام حسب ذیل ہیں:

شیخ محی الدین ابن عربی، شیخ شہاب الدین سہروردی، شیخ صدرالدین قونوی، شیخ اوحدالدین کرمانی، امام نجم الدین رازی اور قطب الدین شیرازی جو اپنے وقت کے بزرگ فلسفی تھے۔ بعض روایتوں میں شیخ سعدی سے ملاقات کا ذکر بھی ملتا ہے لیکن ان سب کے باوجود ''شمس تبریزی'' کی ملاقات کا واقعہ رومی کی زندگی کا سب سے مہتم بالشان واقعہ ہے کیونکہ ان کی زندگی کا دوسرا دور درحقیقت شمس تبریز کی ملاقات سے شروع ہوتا ہے۔ ان کی ملاقات سے پہلے مولانا روم درجہ کمال کو پہنچ چکے تھے اور اپنے دور کے علماء اور اکابر میں ان کی حیثیت مسلّم تھی۔ اس کے باوجود رومی کے حالات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ کسی نہ کسی دوست کے خواہاں تھے اور اس ساتھی کے بغیر وہ مضطرب اور بے چین رہتے تھے۔

شمس تبریز سے ملاقات

رومی اور شمس تبریز کی ملاقات کے بارے میں متضاد روایات ملتی ہیں۔ مناقب العارفین اور رسالہ سپہ سالار کی روایتوں کے مطابق شمس تبریزی جن کا پورا نام ''شمس الدین محمد بن علی بن ملک داد تبریزی'' تھا بچپن سے عشق نبوی میں ایسے مستغرق تھے کہ تیس چالیس دن تک انہیں کھانے پینے کی خواہش نہ ہوتی۔ وہ علوم ظاہری کی تحصیل کے بعد شیخ ابوبکر سلہ باف اور بعض روایتوں میں شیخ زین الدین سنجاسی کے مرید ہوئے، بابا کمال جندی سے بھی انہوں نے فیض حاصل کیا۔ اس کے بعد انہوں نے مردانِ حق کی تلاش میں سفر شروع کیا۔ کثرتِ سفر کی وجہ سے لوگ ان کو ''شمس پرندہ'' کہنے لگے۔ وہ کسی کو اپنی صحبت کا متحمل نہیں پاتے تھے اور اکثر یہ دعا کرتے تھے کہ:

''خداوندا می خواہم کہ از محبوبان مستور خود یکے را بمن بنمائے۔''[۱۴]

(خدایا کوئی رفیق ایسا عطا کر جو میری صحبت کا متحمل ہو)

آخران کی یہ آرزو مولانا روم کی ملاقات سے پوری ہوئی۔ شمس ۱۲ جمادی الآخر ۶۴۲ ھ (مطابق ۳۰ نومبر ۱۲۴۴ء) کو قونیہ تشریف لائے۔ (۱۵)

اس تاریخ کے متعلق جامی اور افلا کی دونوں کا اتفاق ہے۔ شمس اور رومی کی ملاقات کی پہلی روایت افلا کی کی ہے:

شمس تبریزی روم روانہ ہوئے اور شکر فروشان کے محلے میں قیام فرمایا۔ حسب عادت ایک حجرہ کرایہ پر لیا۔ اس میں قیمتی تالا ڈالا تا کہ لوگ سمجھیں کہ کوئی بڑا تاجر ہے۔

''حجرہ برگرفت و بر در حجرہ اش دوسہ دیناری قفلی نادری نہادتا خلق راگمان آید کہ تاجر بزرگ است''(۱۶)

ایک روز مولانا مدرسہ سے نکل کر خچر پر کہیں تشریف لے جا رہے تھے، متعدد طلبا ہم رکاب تھے۔ شمس نے مولانا کو دیکھا ان کی طرف بڑھے اور کہا:

''نقود معانی وعالم اسماء کے صراف یہ بتایئے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم زیادہ افضل و بزرگ ہیں یا بایزید بسطامی؟ مولانا نے فرمایا کہ یہ کیا پوچھ رہے ہیں۔ آں حضرت تمام انبیاء واولیاء کے قافلہ سالار وسردار ہیں۔ ہر قدم کی بزرگی وفضلیت آپ ہی کو ہے۔ انہوں نے پھر کہا تو اس کے کیا معنی کے حضور ہمیشہ فرمایا کرتے کہ: ''**سبحانک ماعرفناک حق معرفتک**'' (اے خداوند تو پاک و برتر ہے ہم نے جیسا تجھے پہچاننا چاہئے تھا نہ پہچانا) اور بایزید بسطامی کہتے ہیں: ''سبحانی ما اعظم شانی وانا سلطان السلاطین'' (میں پاک ہوں میری شان کتنی بڑی ہے۔ میں تو بادشاہ کا بادشاہ ہوں)

مولانا نے اس سوال کی ہیبت سے ایک نعرہ مارا اور بے ہوش ہو گئے، ہنگامہ مچ گیا، تھوڑی دیر بعد ہوش آیا تو آپ نے سوالات کے جوابات ارشاد فرمائے کہ بایزید بسطامی سلوک میں ایک مقام پر رک گئے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سلوک روحانی میں ہر روز ستر مقامات عبور فرماتے تھے کہ دوسرے کو پہلے سے کوئی نسبت نہ ہوتی، چنانچہ جب اگلے مقام کی سیر سے بہرہ مند ہوتے تو اس سے نیچے کے مقام پر ٹھہرنے کے خیال سے استغفار فرماتے تھے۔ بایزید بسطامی کی پیاس ایک گھونٹ سے رفع ہو گئی تھی، وہ مکمل طور پر سیراب ہو گئے تھے اور ان کے ادراک کا برتن بھر چکا تھا مگر آنحضرت کا استقسائے عظیم بھلا کیسے سکون پا سکتا تھا۔ آپ ہر لحہ مزید کے طلب گار تھے۔

دونوں ایک دوسرے سے بغل گیر ہوئے مولانا شمس کو ساتھ لے کر اپنے مقام پر آئے اور حجرے میں رہے اور تذکروں کے مطابق تین مہینہ تک یہ دونوں ایک کمرے میں بند رہے اور روحانی مدارج طے کرتے رہے۔

''تا چہل روز تمام ہیچ آفریدہ را راہ ندادند بعضی گویند سہ ماہ تمام از حجرہ بیرون نیامدند۔''(۱۷)

مولانا روم جب حجرہ سے باہر آئے تو ان کی دنیا بدل چکی تھی۔ درس وتدریس، وعظ وتذکیر سب چھوڑ دیا۔ طلبا اور اہل علم ایک دم محروم ہو گئے۔

زاہد بودم ترانہ گویم کردی سرفتنۂ بزم وبادہ جویم کردی

سجادہ نشین باوقارے بودم بازیچۂ کود کانِ کویم کردی[۱۸]

(میں زاہد تھا آپ نے مجھے گانے بجانے والا کر دیا، بزم میں غل مچانے والا اور شراب کا خواہاں بنا دیا، نیز ایک باوقار سجادہ نشین تھا آپ نے مجھے بچوں کا کھلونا بنا دیا۔)

تذکروں میں شمس اور رومی کی ملاقات کے بارے میں دو اور روایتیں بھی ملتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ جب شمس الدین قونیہ پہنچے اور مولانا کی مجلس میں آئے تو اس وقت مولانا ایک حوض کے کنارے بیٹھے ہوئے تھے اور چند کتابیں سامنے رکھی ہوئی تھیں۔ شمس نے پوچھا یہ کیسی کتابیں ہیں؟ مولانا نے فرمایا کہ یہ قیل وقال ہیں، آپ کو اس سے کیا کام؟ شمس نے سب کتابوں کو پانی میں ڈال دیا۔ مولانا نے سخت رنجیدہ ہو کر فرمایا کہ یہ کیا کیا؟ شمس نے ہاتھ بڑھا کر ایک ایک کتاب حوض سے باہر نکال کر رکھ دی۔ کتابوں پر پانی کا اثر تک نہ تھا۔ مولانا نے کہا کہ یہ کیا راز ہے؟ شمس نے جواب دیا کہ یہ ذوق وحال ہے آپ کو اس سے کیا مطلب؟

بعض دوسرے تذکروں میں پانی کی جگہ آگ لگنے کی روایت ہے۔ دوسری روایت یہ ہے کہ شمس قونیہ آئے۔ ایک روز دیکھا کہ مولانا سوار چلے آ رہے ہیں اور لوگ ان سے مستفید ہو رہے ہیں۔ شمس نے آگے بڑھ کر پوچھا کہ ریاضیات وعلوم سے غرض کیا ہے؟ مولانا نے کہا: آداب شریعت کا جاننا، شمس نے کہا: نہیں، غرض یہ ہے کہ معلوم تک رسائی ہو جائے اور حکیم سنائی کا یہ شعر پڑھا تو مولانا اس سے متغیر اور متحیر ہوئے:

علم کز تو ترانہ بستاند

جہل از آں علم بہ بود بسیار

(جو علم تجھے تجھ سے نہ لے لے، اس علم سے جہل بہت بہتر ہے)

اُوپر جو روایتیں نقل ہوئی ہیں یہ مستند کتابوں مثلاً مناقب العارفین، رسالہ سپہ سالار اور جواہر مضیہ میں موجود ہیں۔

اب یہ حالت ہوئی کہ رومی ہر بات میں شمس کی پیروی کرتے تھے اور ان سے شدید محبت کرنے لگے تھے۔ وہ شمس کی ہر بات غور سے سنتے اور اس پر عمل کرتے تھے حتیٰ کہ شمس نے انہیں اپنے والد، سلطان العلماء کی کتابیں پڑھنے سے بھی منع کر دیا۔[۱۹]

رومی جب ہر بات میں شمس کی پیروی کرنے لگے اور ان کے سارے تعلقات منقطع ہونے لگے تو یہ بات رومی کے شاگردوں اور مریدوں کو ناگوار گزری۔ وہ لوگ سوچ رہے تھے کہ ہم نے عمریں

مولانا کی خدمت میں گزار دیں، مولانا کی کرامتوں کو دیکھا، تمام اطراف واکناف میں آپ کی شہرت ہے، اب ایک بے نام ونسب شخص آیا اوراس نے مولانا کو سب سے الگ کرلیا کہ آپ کی صورت تک دیکھنا نصیب نہیں ہوتی، درس وتدریس، وعظ وتذکیر سب بند ہوگئی۔ضرور یہ کوئی ساحر یا مکار شخص ہے ورنہ اس کی کیا مجال کہ ایسے پہاڑ کو یوں تنکے کی طرح بہالے جائے۔

غرض سبھی شمس کے دشمن ہو گئے۔شمس ان لوگوں کی وجہ سے آزردہ خاطر رہنے لگے اور جب ان کو یقین ہو گیا کہ اب اس معاملے کا انجام فتنہ وفساد پر ہوگا تو ایک دن خاموشی کے ساتھ قونیہ سے نکل گئے۔افلاکی نے شمس کی غیبت کی تاریخ بیست ویکم شوال ۶۴۳ھ دی ہے۔

''ہمانا کہ روز پنجشنبہ بیست ویکم بشوال سنہ ثلاث واربعین وسبعمائۃ حضرت مولانا شمس الدین غیبت نمود''(۲۰)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شمس نے تقریباً سوا سال قونیہ میں قیام کیا۔شمس کی غیبت کے بعد مولانا پر ایک بے چینی کی کیفیت طاری ہوگئی۔مولانا شمس کے مخالفین سے سخت ناراض ہوکر بالکل خانہ نشین ہو گئے۔رومی کی شاعری کا آغاز شمس کی ملاقات سے ہوا تھا وہ بھی شمس کی جدائی کے بعد بند ہوگیا۔اس حالت میں تبدیلی اس وقت آئی جب ایک دن مولانا کے نام دمشق سے شمس کا ایک خط آیا۔پھر سے رومی نے شمس کے عشق میں غزلیں کہنا شروع کیں اور سماع کی طرف متوجہ ہوئے۔

باز آمد آن مہے کہ ندیدش فلک بخواب   آورد آتشے کہ نمیرد بہ ہیچ آب
بنگر بخانۂ تن وبنگر بہ جان من   از جام عشق اوشد ایں مست وآں خراب(۲۱)

(وہ مہتاب جسے آسمان نے بھی کبھی خواب میں نہ دیکھا تھا واپس آ گیا اور ایسی آگ لے کر آیا جو کسی پانی سے نہیں بجھتی ہے۔میرے جسم کے گھر اور جان کو دیکھو اس کے جام عشق سے جسم مست اور جان خراب حال ہے۔)

قونیہ کے حاسدین اور مفسدین مولانا کی بے توجہی سے بہت شرمسار ہوئے اور مولانا سے معافی مانگ لی۔رومی نے انہیں معاف کر دیا اور اپنے بیٹے سلطان ولد سے کہا کہ تم دمشق جا کر شمس کو اپنے ساتھ لے آو۔سلطان ولد احباب کے ساتھ دمشق پہنچے بڑی مشکل سے شمس کا پتہ چلا اور ان کو ساتھ لے کر قونیہ پہنچے۔شمس کے پہنچنے پر رومی کی مسرت کی کوئی انتہا نہیں تھی، جن لوگوں سے گستاخیاں سرزد ہوئی تھیں شمس نے ان سب کو معاف کر دیا، پھر سے سماع کی محفلیں منعقد ہونے لگیں۔اس دور میں رومی نے ایسی غزلیں کہیں جن میں شمس کی واپسی پر مسرت کا اظہار کیا گیا ہے۔

شمس تبریز طلوعی بکن از مشرق جان   کہ چو خورشید تو جانی وجہاں جملہ بدن
پیر من و مرید من درد من و دوای من   فاش بگویم این سخن شمس من وخدای من(۲۲)

(شمس تبریزی جان کے افق سے طلوع ہو جاؤ کیونکہ تم خورشید کی طرح دنیا کی جان اور تمام

عالم، بدن کے مثل ہے۔ میرا مرید، میرا درد، میرا درمان بلکہ صاف صاف یہ کہوں کہ میرا شمس، میرا خدا ہے)

دمشق سے واپس ہونے کے بعد شمس نے مولانا کی حرم محترم کی پروردہ ایک لڑکی کیمیا خاتون کی خواستگاری کی تو مولانا نے بھی بہ دل وجان قبول کیا۔ شمس کی شادی کیمیا خاتون سے ہوئی اور یہ بات محسوس کی جانے لگی کہ اب شمس زیادہ اطمینان کے ساتھ قونیہ میں قیام کریں گے۔(۲۳)

لیکن یہ خوشی جلد ہی ختم ہوگئی۔ جب شمس کی شادی ہوئی تو رومی نے اپنے گھر کے ایک طرف شمس کے قیام کا انتظام کر دیا۔ مولانا کے بیٹے علاء الدین جب رومی اور اپنی والدہ سے ملنا چاہتے تو اسی طرف سے گزرتے جدھر شمس کا قیام تھا۔ شمس کو یہ بات ناگوار گزرتی اور کئی مرتبہ ان کو سمجھانے کی کوشش کی کہ اس طرح بے تکلف ادھر سے نہ گزرا کریں۔ علاء الدین کو یہ بات بری لگی۔ انہوں نے اس بات کو دوسرے لوگوں سے بتایا اور دوبارہ حاسدوں اور مفسدوں کو موقع ملا کہ شمس کے خلاف فتنہ شروع کریں۔ شمس نے صرف لطف وحلم کی وجہ سے رومی سے اس واقعہ کا کچھ ذکر نہیں کیا۔(۲۴)

مناقب العارفین میں شمس کی رنجش کی ایک اور وجہ یہ بھی درج ہے کہ:

''منقول است کہ منکوحہ مولانا شمس الدین کیمیا خاتون زنے بود جمیلہ وعفیفہ، مگر روزے بی اجازت اور زنان اوراصحوب جدہ سلطان ولد برسم تفرج بباغش بردنداز ناگاہ، حضرت مولانا شمس الدین بخانہ آمدند اوراطلب داشت گفتند جدہ سلطان ولد باخواتین اورابتفرج بردند، عظیم نالید وبغایت رنجش نمود۔ چون کیمیا خاتون آمد دل درد کردن گرفتہ ہچوں چوب خشک بیحرکت شد فریاد کنان بعد از سہ روز نقل کرد ہمچنان چون ہفتم او بگذشت باز سوی دمشق روانہ شد در ماہ شعبان سنہ اربعہ واربعین وستمائۃ''(۲۵)

ترجمہ (ایک روز کیمیا خاتون مکان سے باہر چلی گئی تھیں، شمس جب مکان میں آئے اور اپنی بیوی کے بارے میں دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ سلطان ولد کی دادی اور چند دوسری عورتوں کے ساتھ باہر سیر کو گئی ہیں، شمس نہایت آزردہ خاطر ہوئے کیمیا خاتون جب مکان میں آئیں تو ان کا پیٹ درد کرنے لگا اور اس واقعہ کے تین روز بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ بیوی کے انتقال کے سات روز بعد شمس دمشق کو روانہ ہو گئے۔ یہ واقعہ ۱۰ شعبان ۶۴۴ھ کو پیش آیا۔)

صبح کو جب مولانا مدرسہ میں تشریف لائے اور شمس کو گھر میں نہیں دیکھا تو بہاء الدین سلطان ولد کے پاس جا کر پوچھا:

''بہاء الدین چہ خفتہ، برخیز وطلب شیخت کن کہ باز مشام جانرا از فوائح لطف او خالی می یابیم''(۲۶)

(بہاء الدین سو کیا رہے ہو، اٹھو اور شیخ کو ڈھونڈو کہ ان کے لطف وکرم کی عطر بیز خوشبوؤں سے مشام جان خالی معلوم ہو رہا ہے۔)

سبھی نے ہر طرف تلاش کیا لیکن شمس کا پتہ نہ چلا،قونیہ میں شمس کی وفات کی خبر پھیل گئی۔رومی کو اس خبر پر یقین نہیں آیا۔انہوں نے اپنے الفاظ میں اس کی تردید بھی کردی۔

کہ گفت کہ آن زندۂ جاوید بمرد کہ گفت کہ آفتاب امید بمرد
آن دشمن خورشید برآمد بربام دو چشم بست و گفت خورشید بمرد[۲۷]

(کون کہتا ہے کہ جو ہمیشہ رہنے والا زندہ جاوید ہے وہ فوت ہوگیا۔کس نے کہا امیدوں کا آفتاب غروب ہو چکا ہے۔دیکھو آفتاب کا ایک دشمن بام پر آکر کھڑا ہوا آنکھیں بند کر کے کہہ رہا ہے کہ آفتاب ڈوب چکا ہے)

شمس کے غائب ہونے کے بعد مولانا نے کئی برس تک ان کی جستجو کی،اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ مولانا اور ان کے اصحاب خاص کو شمس کی وفات کا یقین نہیں تھا۔اس زمانے میں مولانا کا یہ حال تھا کہ اگر کوئی جھوٹ بھی کہہ دیتا کہ میں نے شمس الدین کو فلاں جگہ دیکھا تو مولانا اس کو شکرانہ دیتے اور بہت شکریہ ادا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ ایک شخص نے آکر کہا کہ میں نے مولانا شمس الدین کو دمشق میں دیکھا ہے۔مولانا اس قدر مسرور ہوئے کہ جو کچھ پہنے ہوئے تھے سب اس آدمی کو دے دیا۔موزے تک اُتار کر دے دیے،اس کے بعد کسی نے کہا کہ اس نے دیکھا نہیں ہے،یہ خبر غلط ہے۔مولانا نے کہا:

''برای خبر دروغ از دستار وفرجی دادم چہ اگر راست بودی بجائے جامہ جان میدادم وخودم رافدای اومیکردم''[۲۸]

(اگر خبر صحیح ہوتی تو میں لباس کی بجائے جان کیوں نہ دے دیتا اور اس پر فدا کیوں نہ ہوجاتا)

اس مرتبہ مولانا نے شمس کی جستجو میں دوبار دمشق کا سفر کیا۔دمشق سے واپس آنے کے بعد رومی،شمس کی ملاقات سے بالکل مایوس ہوگئے اور انہیں شمس کی وفات کا یقین ہوگیا تھا۔اس مرتبہ مولانا کی حالت پہلے سے زیادہ متغیر ہوگئی اور انہوں نے غزل گوئی اور سماع میں اپنا وقت گزارنا شروع کیا۔

جس طرح سے رومی اور شمس کی ملاقات کے بارے میں مختلف روایتیں مشہور ہیں،اسی طرح شمس کی غیبت کے بارے میں بھی مختلف روایتیں ملتی ہیں۔ان مختلف روایتوں میں سے جو روایت زیادہ مستند ہے وہ یہ کہ شمس تبریزی نااہلوں کے ہاتھ سے زخمی ہو کر ہمیشہ کے لیے غائب ہوگئے۔افلاکی لکھتا ہے کہ بعض اصحاب کا اس پر اتفاق ہے کہ مولانا شمس الدین اس جماعت سے زخم کھا کر غائب ہوگئے اور بعضوں نے یہ روایت کی ہے کہ مولانائے بزرگ کے پہلو میں آپ ہی مدفون ہوئے۔[۲۹]

مولانا رومی کا اخلاق وکردار

مولانا روم کی ریاضت اور مجاہدہ حد سے زیادہ بڑھا ہوا تھا۔سپہ سالار کا بیان ہے کہ میں نے

کبھی ان کو شب خوابی کے لباس میں نہیں دیکھا۔ قصداً لیٹتے نہ تھے۔ جب نیند غالب ہوتی تو بیٹھے بیٹھے سو جاتے۔ نماز کا وقت آتا تو ان کے چہرے کا رنگ بدل جاتا۔ نماز میں نہایت استغراق کی حالت میں ہوتے تھے۔ مزاج میں انتہا درجہ کی قناعت و زہد تھا۔ روزہ اکثر رکھتے تھے۔ معتبر روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلسل دس دس، بیس بیس دن کچھ نہ کھاتے تھے۔ جس دن ان کے گھر میں کھانے کا کچھ سامان نہ ہوتا بہت خوش ہوتے اور کہتے کہ آج ہمارے گھر میں درویشی کی بو آتی ہے۔

مولانا اگرچہ بچپن ہی سے مراتب سلوک طے کرتے رہے تھے پھر بھی زندگی کے آخری دن تک شرع کی پابندی میں مطلقاً کوئی فرق نہیں آیا۔ وہ علمائے ظاہری کے لباس میں رہے اور فتویٰ نویسی کا شغل تو آخر تک جاری رہا۔ تمام سلاطین و امرا ہر قسم کے تحائف بھیجتے تھے لیکن مولانا اپنے پاس کچھ نہیں رکھتے چونکہ رومی مفت خوری کو نہایت ناپسند کرتے تھے اس لیے اس کے معاوضے میں فتویٰ لکھا کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے احباب کو بھی نصیحت کی کہ: ''کم خوردن، کم گفتن اور کم خفتن'' تزکیۂ نفس و روح کے لیے ضروری ہے۔

باوجود شان و عظمت وہ بہت بے تکلف اور متواضع تھے۔ ایک دفعہ مسجد میں جمعہ کے دن وعظ کی مجلس تھی تمام امرا اور صلحا حاضر تھے۔ مولانا نے قرآن مجید کے دقائق اور نکات بیان کرنا شروع کیے۔ اس زمانے میں وعظ کا یہ طریقہ تھا کہ قاری قرآن مجید کی چند آیتیں پڑھتا تھا اور واعظ ان ہی آیتوں کی تفسیر بیان کرتا تھا۔ مجمع میں ایک فقیہ بھی تشریف رکھتے تھے ان کو حسد پیدا ہوا بولے کہ آیتیں پہلے سے مقرر کر لی جاتی ہیں ان کے متعلق بیان کرنا کیا کمال کی بات ہے۔ مولانا نے ان کی طرف خطاب کر کے کہا کہ آپ کوئی سورہ پڑھیے میں اس کی تفسیر بیان کرتا ہوں۔ انہوں نے ''والضحیٰ'' پڑھی۔ مولانا نے اس سورہ کے دقائق اور لطائف بیان کرنا شروع کیا تو صرف والضحیٰ کے ''واؤ'' کے متعلق اس قدر شرح و بسط سے بیان کیا کہ شام ہو گئی۔ تمام مجلس پر ایک وجد کی حالت طاری تھی۔ فقیہ بھی ایسے سرشار ہوئے کہ مولانا کے قدموں پر گر پڑے۔ اس جلسے کے بعد مولانا نے پھر وعظ نہیں کیا۔ فرمایا کرتے تھے کہ جس قدر میری شہرت بڑھتی جاتی ہے میں بلا میں مبتلا ہوتا جاتا ہوں لیکن کیا کروں کچھ تدبیر بن نہیں پڑتی۔

''گویند وعظ آخرین خداوندگار رحمان بود و دیگر بتذکیر شروع نفرمود''(۳۰)

مثنوی معنوی

جلال الدین رومی کو جو شہرت حاصل ہوئی وہ ان کی مثنوی کی بدولت ہے۔ رومی اپنی فکر و فن کو انسان کی تعلیم و تربیت میں صرف کرتے رہے چنانچہ وہ اپنے دور کے انسانوں کو فکری و عملی انقلاب کی دعوت دیتے تھے تاکہ ایک ترقی یافتہ اور تربیت یافتہ معاشرہ وجود میں آ سکے۔ رومی کا عہد آشوب و فساد سے مملو تھا۔ ان حالات میں انہیں عرفان و تصوف کی دنیا ہی ایسی دکھائی دی جہاں انسان کو سکون اور طمانیت میسر ہو سکتی تھی۔ اس لیے انہوں نے اپنے روحانی افکار و خیالات کو اشعار اور ملفوظات کے ذریعہ عام لوگوں تک

پہنچانے کی کوشش کی۔ انہوں نے عارفانہ، فلسفیانہ اور اخلاقی مطالب کو مختلف طریقوں سے بیان کیا ہے۔

مثنوی معنوی، رومی کے اشعار کا بہترین مجموعہ ہے۔ یہی کتاب ہے جس نے رومی کے نام کو آج تک زندہ رکھا ہے۔ مثنوی کو جس قدر مقبولیت حاصل ہوئی فارسی کی کسی کتاب کو آج تک نہیں ہوئی۔ اس مثنوی کا عربی، انگریزی، اردو، جرمنی، ترکی کے علاوہ دیگر مختلف زبانوں میں ترجمہ کیا جا چکا ہے۔

مثنوی معنوی کے اشعار کی مجموعی تعداد جیسا کہ رسالہ سپہ سالار میں ہے ۲۶۶۰۰ ہے۔ یہ اشعار بحر رمل میں کہے گئے ہیں اور چھ دفتروں پر مشتمل ہیں۔ اس میں رومی نے عبارت آرائی اور الفاظ کے موزوں استعمال پر پوری توجہ دی ہے لیکن اس کے باوجود عرفانی حقائق اور معانی بیان کرنے کا شوق رومی پر اس قدر غالب تھا کہ بعض اشعار میں انہوں نے لفظی آرایش کی بندش اور عروض وقوافی کی قیدو بند پر کچھ زیادہ توجہ نہیں کی ہے۔ اس لیے مثنوی میں ہمیں بعض ایسے اشعار بھی نظر آتے ہیں جو فصاحت لفظی اور بعض لفظوں اور قافیوں کے اعتبار سے دلکش نہیں۔ مولانا اس حقیقت پر نظر رکھتے ہوئے کہتے ہیں:

غیر نطق و غیر ایما وسجل

صد ہزاراں ترجمان خیزد ز دل (۳۱)

دراصل مثنوی کی مقبولیت کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اس میں حقائق و معارف کو قصوں کے ذریعہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ کتاب فارسی میں تصوف کا بہترین اور مکمل ترین مجموعہ ہے اور نہ صرف تصوف بلکہ علم کلام اور عقائد کی بھی بہترین تصنیف ہے۔ بقول حالی:

> ''مثنوی میں شعر اور تصوف کے علاوہ قصے کا لطف اور مذہب کی عظمت بھی شامل ہے۔ یہی باعث ہے کہ مولانا روم کے حق میں ''نیست پیغمبر ولی دارد کتاب'' اور مثنوی کے حق میں ''ہست قرآن درزبان پہلوی'' کہا گیا ہے۔''(۳۲)

رومی نے مثنوی کے قصوں اور حکایات سے جو نتائج اخذ کئے اور جو اخلاقیات کی تعلیم دی ہے اس کی نظیر نہیں ملتی۔ انہوں نے اپنے مخصوص پیرایۂ بیان میں چھ دفتروں میں تصوف اور سلوک کے مسائل بیان کر دیے ہیں جن کا طرز استدلال اور سمجھانے کا طریقہ بہت الگ ہے۔ وہ فلسفیانہ موضوعات کو تشبیہوں اور تمثیلوں کے ذریعہ سے قارئین کو ذہن نشین کراتے ہیں۔ اس بنا پر مثنوی میں ایسی زبان استعمال کی گئی ہے جو سب کی سمجھ میں آ سکے کیونکہ مثنوی کے مخاطب عوام اور خواص سبھی ہیں اور اس کا انداز بیان عقل سے زیادہ دل کو متاثر کرتا ہے۔ تذکروں کے مطابق مثنوی کی تصنیف میں رومی کے مرید خاص، حسام الدین چلپی کو بہت دخل ہے۔ انہوں نے رومی سے درخواست کی کہ منطق الطیر یا حدیقہ سنائی کے طرز پر ایک مثنوی تصنیف فرمائیں۔ مولانا نے سنتے ہی اپنے عمامہ سے ایک کاغذ نکالا جس میں اٹھارہ شعر لکھے ہوئے تھے۔ پہلا شعر وہ تھا جس سے مثنوی کا آغاز ہوتا ہے۔

بشنو از نے چوں حکایت می کند

از جدائی ہا شکایت می کند[۳۳]

دراصل مثنوی معنوی، حسام الدین چلپی کی تحریک پر وجود میں آئی۔ رومی نے تقریباً بارہ برس کی مدت تک مثنوی کے اشعار حسام الدین کو لکھواتے رہے۔ مثنوی کے دفتر اول کے سوا دوسرے پانچ دفتر حسام الدین چلپی کے نام سے مزین ہیں۔ دفتر اول کس تاریخ کو شروع ہوا یہ ٹھیک طور پر معلوم نہیں لیکن اس دفتر کے اختتام کے تقریباً دو سال بعد دوسرا دفتر شروع ہوا اور اس کی تاریخ ۶۶۲ھ ہے۔

اس دو سالہ وقفہ کی وجہ یہ ہے کہ مثنوی کا پہلا دفتر ختم ہوتے ہی حسام الدین کی بیوی کا انتقال ہو گیا۔ اس حادثہ سے وہ اس قدر متاثر ہوئے کہ دو سال تک افسردہ اور پریشان رہے۔ چونکہ ان کی طرف سے مثنوی کو جاری رکھنے کی تحریک نہ ہوئی رومی بھی اس عرصہ میں خاموش رہے اور مثنوی کا کام رک گیا، آخر خود حسام الدین کی درخواست پر مثنوی کی تصنیف کا سلسلہ پھر سے شروع ہوا۔ دفتر دوم کے ابتدائی اشعار میں رومی اس تاخیر کو واضح کر کے کہتے ہیں:

مدتی این مثنوی تاخیر شد مہلتی بایست تا خون شیر شد
چوں ضیاء الحق حسام الدین عنان باز گردانید زاوج آسمان
چوں بمعراج حقائق رفتہ بود بے بہارش غنچہ ہا نشکفتہ بود

(ایک مدت تک مثنوی لکھنے میں تاخیر ہو گئی، کچھ وقت چاہیے تا کہ خون سے دودھ بنے۔
چوں ضیاء الحق حسام الدین نے آسمان کی بلندی سے باگ موڑی۔ چونکہ وہ حقائق کی معراج میں پہنچے ہوئے تھے، ان کی بہار کے بغیر غنچہ نہ کھلے تھے)

رومی کی مثنوی میں جو بات قاری کے لیے باعث کشش ہے وہ یہ ہے کہ وہ اخلاق اور تصوف کے اعلیٰ ترین اسرار کو عام فہم قصے کے ذریعہ بیان کرتے ہیں۔ لیکن یہ قصص اور امثال طبع زاد نہیں ہیں انہیں رومی نے دوسری کتابوں سے اخذ کیا ہے۔ کبھی قرآن و احادیث کے ذریعہ سے، کبھی قصص انبیاء اور کبھی مختلف تمثیلات سے۔ ان حکایات کے ضمن میں رومی نے اخلاقی اور فلسفیانہ مسائل کی تعلیم کو مرتبہ کمال تک پہنچا دیا ہے اور نفس انسانی کے جن پوشیدہ عیوب کو ظاہر کیا ہے، عام لوگوں کی نگاہیں وہاں تک نہیں پہنچ سکتی تھیں۔ ایک مثال ملاحظہ ہو:

یک موذن داشت بس آواز بد شب ہمہ شب می دریدی حلق خود
خواب خوش برمرد مان کردہ حرام در صداع افتادہ از وی خاص وعام[۳۴]

کسی گاؤں میں ایک بدآواز موذن تھا۔ اپنی کریہہ آواز سے گاؤں کے لوگوں کا اس نے جینا حرام کر دیا تھا۔ لوگوں نے اس کو روپے دیے کہ وہ حج کر آئے۔ دوران سفر راہ میں ایک گاؤں آیا وہاں ایک مسجد تھی۔ مؤذن نے اس میں جا کر اذان دی۔ تھوڑی دیر بعد ایک مجوسی کپڑوں کا جوڑا اور مٹھائی لے کر حاضر ہوا کہ مؤذن صاحب کہاں ہیں کہ میں ان کے لیے نذر لایا ہوں کہ انہوں نے مجھ پر بڑا احسان

کیا ہے کہ میری ایک لڑکی جو نہایت عاقلہ اور نیک طبع ہے معلوم نہیں کیوں کر اس کا اسلام کی طرف میلان ہو گیا تھا، ہر چند اس کو سمجھایا مگر باز نہیں آتی تھی۔ آج جو مؤذن نے اذان کہی اس نے گھبرا کر پوچھا کہ یہ کیسی مکروہ آواز ہے؟ لوگوں نے کہا کہ یہ مسلمانوں کی عبادت کا طریقہ ہے۔ پہلے تو اس کو یقین نہیں آیا لیکن جب تصدیق ہو گئی تو اس کو اسلام سے نفرت ہو گئی، اس لیے مؤذن صاحب کے لیے تحفہ لایا ہوں کہ جو کام میں انجام نہیں دے سکا وہ ان کی بدولت پورا ہو گیا۔

چون یقین گشتش رخ او زرد شد   از مسلمانی دل او سرد شد
باز رستم من ز تشویش و عذاب   دوش خوش خفتم در آن بیخوف خواب

رومی اس حکایت سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ ہماری بھی یہی حالت ہے۔ آج کل مسلمان جو اپنا نمونہ پیش کر رہے ہیں، اس سے دوسری قوموں کو اسلام سے محبت کے بجائے نفرت پیدا ہو رہی ہے۔ ان کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ پہلے اپنے اندر حسن و ذوق پیدا کریں۔ جس مبلغ کے فعل و عمل میں دلکشی نظر نہ آئے وہ دوسروں کے لیے باعث نفرت بن جاتا ہے۔

ہست ایمان شما زرق و مجاز
راہزن ہمچون کہ آن بانگ نماز (۳۵)

مثنوی حکمت و عرفان کے اسرار و رموز کا ایک لامتناہی سمندر ہے۔ اس کے مطالعہ سے اسلام کا جو تصور پیدا ہوتا ہے وہ ایک طرح سے صوفیانہ اسلام ہے۔ یہ تصور تنگ نظری اور رسمیت سے دور ہے۔ اس میں مغز اور معنی کو اہمیت حاصل ہے۔ رومی کی مثنوی ان کے افکار عالیہ اور تصوف کے اسرار و رموز کا ایک گنجینہ ہے۔ وہ ہر حکایت اور روایت سے اپنے صوفیانہ رنگ میں نتیجہ نکالتے ہیں۔

دوسری مثال ملاحظہ ہو:

ایک جنگل میں شیر اور دوسرے جانوروں میں یہ معاہدہ ٹھہرا کہ وہ ہر روز شیر کو گھر بیٹھے اس کی خوراک پہنچایا کریں گے۔ پہلے ہی دن جو خرگوش، شیر کی خوراک کے لیے مقرر کیا گیا تھا وہ ایک دن تاخیر سے گیا۔ شیر غصے سے خرگوش سے تاخیر کی وجہ پوچھی، خرگوش نے کہا میں تو اسی دن چلا تھا لیکن راستے میں ایک دوسرے شیر نے روک لیا۔ میں نے کہا کہ حضور کی خدمت میں جاتا ہوں مگر اس نے ایک نہ سنی، بڑی مشکل سے ضمانت پر چھوڑا ہے۔ شیر نے غصے میں پوچھا کہ وہ شیر کہاں ہے میں ابھی چل کر اس کو سزا دیتا ہوں۔ خرگوش شیر کو ایک کنویں کے پاس لے جا کر کھڑا کر دیا کہ حریف اس میں ہے۔ شیر نے کنویں میں جھانکا اور اپنے ہی عکس کو اپنا حریف سمجھا اور بڑے غصے میں حملہ آور ہو کر کنویں میں کود پڑا۔

عکس خود را او عدّو خویش دید   لاجرم بر خویش شمشیری کشید
اے بسا ظلمی کہ بینی در کسان   خوی تو باشد در ایشان ای فلان
اندر ایشان تافتہ ہستی تو   از نفاق و ظلم و بدمستی تو

آن توئی واں زخم برخود میزنی
برخود آں دم تار لعنت می تنی (۳۶)

مولانا روم اس حکایت سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ ہماری بھی یہی حالت ہے۔ ہمیں دوسروں کے عیوب تو بہت برے معلوم ہوتے ہیں لیکن ہم یہ نہیں سوچتے ہیں کہ شاید یہ عیب ہم میں بھی موجود ہو اور اس بنا پر ہم شیر کی طرح اپنے آپ پر حملہ کرتے ہیں اور اپنے آپ کو برا کہتے ہیں۔

ہمچوں آن شیر ے کہ برخود حملہ کرد حملہ برخود می کنی اے سادہ مرد
پس بدانی کز تو بود آں ناکسی (۳۷) چون بقعر خوے خود اندر رسی

مثنوی اس طرح کے اخلاقی حکایتوں سے بھرپور ہے۔ جہاں کوئی عبارت مکرر آئی ہے وہاں تکرار صرف ظاہری ہے حقیقی نہیں اور نتائج ہر جگہ الگ الگ نکالے گئے ہیں۔ دراصل رومی نے اخلاقی و فلسفی موضوعات کو مختلف انداز میں پیش کیا ہے اور ان کی مثنوی متصوفانہ تصورات پر قائم ہے۔ ایک جگہ وہ توکل کے بارے میں کہتے ہیں:

گفت پیغمبر بآواز بلند باتوکل زانوئے اشتر ببند
رمز الکاسب حبیب اللہ شنو از توکل در سبب کاہل مشو
در توکل کسب وجہد اولیٰ ترست تاحبیب حق شوی این بہترست (۳۸)

(حضور نے بہ بانگ بلند فرمایا کہ اونٹ کی رسی باندھو اور پھر اس کی حفاظت اللہ کے بھروسہ پر کرو۔ کمانے والا اللہ کا دوست ہوتا ہے، اس نکتہ کو سنو اور توکل کی وجہ سے کسب کے معاملہ میں سستی نہ کرو۔ تم اگر توکل کرتے ہو تو کام میں لگ کر کوشش کرو اور پھر اللہ پر بھروسہ کرو۔ کیونکہ توکل میں کمائی اور کوشش زیادہ بہتر ہے۔ یہ بہتر ہے تم اس طرح اللہ کے محبوب ہو جاؤ۔)

مولانا روم نے مثنوی میں سماجی بیماریوں اور غلط مذہبی اعتقادات کی نشاندہی کی ہے۔ وہ انسانیت کے پرستار ہیں۔ ''رومی اور چینی نقاشوں کی حکایت'' میں انہوں نے اپنے پیغام کو اس تمثیل کے ذریعہ بیان کیا ہے کہ چینی اور رومیوں کا یہ دعویٰ تھا کہ ہم بہتر مصور ہیں۔ زور آزمائی کے لیے چینی اور رومی فن کاروں کے لیے ایک کمرے میں دو دیواریں آمنے سامنے معین کر دی گئیں جن کے درمیان ایک پردہ حائل تھا۔ ایک دیوار پر چینیوں نے نقاشی کا کام شروع کر دیا اور بڑی محنت سے رنگین تصویریں تیار کیں۔ لیکن رومیوں نے کہا ہم تو دیوار کو صرف صیقل کریں گے اور ہمیں کسی رنگ کی ضرورت نہیں۔ جب چینیوں نے کام ختم کر لیا تو بادشاہ کمرے میں داخل ہوا اور ان کی فن کاری کے حسن سے مبہوت ہو گیا۔ جب وہ رومیوں کے کام دیکھنے کے لیے دوسری دیوار کی طرف متوجہ ہوا تو پردہ ہٹا دیا گیا۔ چینیوں کے خوبصورت اور رنگارنگ نقش ونگار، رومیوں کی صیقل شدہ دیوار پر منعکس ہو گئے۔ یہ دیکھ کر بادشاہ متحیر ہو

گیا۔ کیونکہ رومیوں نے صرف صیقل سے ہی دیوار میں حسن کا رنگ پیدا کر دیا تھا۔

اس حکایت سے مولانا روم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ اپنی ذات کے اعلیٰ اوصاف کو ظاہر کرنے کے لیے ان تمام قوتوں سے نبرد آزمائی ضروری ہے جو ہماری نشوونما میں رکاوٹ بنتی ہیں مثلاً حرص وطمع و نفرت۔ ہم اپنے دل کو صیقل کر کے اعلی صفات کو بروئے کار لا سکتے ہیں۔

رومیاں آں صوفیانند اے پدر　　بے زتکرار وکتاب وبے ہنر
لیک صیقل کردہ اند آں سینہا　　پاک از آز و وحرص وبخل وکینہا
آں صفائے آئینہ لاشک دلست　　کونقوش بے عدد را قابلست
اہل صیقل رستہ انداز بوورنگ
ہر دمے بینند خوبی بے درنگ (۳۹)

مثنوی ایسے ہی اخلاقی حکایات وقصص سے بھری ہوئی ہے اور رومی نے اسے تشبیہوں اور تمثیلوں کے ذریعہ قارئین تک پہنچایا ہے۔ یہ تصنیف رومی کے فکرونظر وتصوف کے نکات کا بہترین شاہکار ہے۔ اس کا اصل مقصد، شریعت کے اسرار ورموز کے مسائل کو بیان کرنا ہے جو رومی نے اپنے اس مقصد کو مثنوی کے ذریعہ سے پورا کیا اور اس کو مرتبہ کمال تک پہنچا دیا۔ اسی دیوان نے مولانا روم کو حیات جاوداں عطا کی۔

وصال

۶۷۲ ھ میں مولانا رومی کی بیماری کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ اس کی خبر عام ہوئی تو سب لوگ عیادت کے لیے آنے لگے۔ شیخ صدر الدین جو شیخ محی الدین اکبر کے شاگرد اور روم وشام میں مرجع عام تھے اپنے تمام مریدوں کے ساتھ ملنے آئے۔ وہ مولانا کی حالت دیکھ کر بے قرار ہوئے اور دعا کی کہ خدا آپ کو جلد شفا بخشے۔ مولانا نے کہا شفا آپ کو مبارک ہو، عاشق اور معشوق میں بس ایک پیرہن کا پردہ رہ گیا ہے کیا آپ نہیں چاہتے کہ وہ بھی اٹھ جائے اور نور، نور میں مل جائے اور یہ شعر پڑھا:

چہ دانی تو کہ در باطن چہ شاہی ہمنشیں دارم　　رخِ زرین من منگر کہ پائے آہنیں دارم
بدان شہ کہ مرا آورد کلی روے آوردم　　وزاں کو آفریدستم ہزاراں آفریں دارم (۴۰)

(تم کو کیا معلوم کہ میرا رفیق دیرینہ کیسا عظیم الشان ہے، میرے زرد چہرہ کو نہ دیکھو میرے پاؤں مضبوط اور آہنی ہیں، میں نے اپنا رخ مکمل طور پر اسی شہنشاہ کی جانب موڑ لیا جس نے میری تخلیق کی اور اس دنیا میں مجھے بھیجا وہی میرا خالق ہے میں اس کا ہزار شکر ادا کرتا ہوں)

آخر میں غروب آفتاب کے وقت ۵ جمادی الثانی ۶۷۲ ھ (مطابق ۱۶ دسمبر ۱۲۷۳ء) کو مولانا کا وصال ہو گیا۔

''ناگاہ روز یکشنبہ در فصل دے پنجم جمادی الآخر ۶۷۲ ھ اثنین وسبعین وستمائۃ درمیان

تقریر حقائق و معارف بوقت غروب آفتاب جلالش در مغرب عالم قدس غروب کرد۔"[۴۱]

مولانا رومی اپنے والد کے مقبرے کے پہلو میں مدفون ہوئے۔ان ہی کے الفاظ میں اس وصال کا وصف آیا ہے:

باز از پستی سوئے بالا شدم طالب آں دلبر زیبا شدم
آشنائی داشتم زان سوے جاں باز ز انجا کامدم آنجا شدم
چار بودم سہ شدم اکنوں دوم از دوئی بگذشتم و یکتا شدم
سالکان راہ را محرم شدم ساکنان قدس را ہمدم شدم
پیش نشترہائے عشق لم یزل
زخم گشتم صدرہ و مرہم شدم[۴۲]

(پھر میں پستی سے بلندی کی طرف پہنچ گیا اور اس دلبر زیبا کا طلب گار ہو گیا۔اس سے میری آشنائی تھی تو جہاں سے آیا تھا وہیں پہنچ گیا۔ چار تھا، تین ہوا، تین سے دو ہوا اور اب دوئی سے گزر کر اکیلا ہو گیا ہوں۔سالکانِ راہ کا میں محرم راز بنا اور عالم قدس کے رہنے والوں کا ہمدم ہو گیا۔حضرتِ لم یزل کے عشق کے نشتروں کے سامنے سیکڑوں زخم کھائے اور پھر مرہم بن گیا۔)

حوالہ جات

۱۔ الجوینی، علاء الدین عطا ملک، تاریخ جہانگشائی، جلد اول، لائیڈن: بریل، ۱۹۱۱ء، ص ۸۱
۲۔ ندوی، عبدالسلام، افکار رومی، دہلی: جامعہ لمیٹڈ، ۱۹۸۱ء، ص ۱۳
۳۔ تلمیذ حسین قاضی، صاحب المثنوی، اعظم گڑھ، دارالمصنّفین، ۱۹۶۷ء، ص ۵۶
۴۔ سپہ سالار، رسالہ سپہ سالار، کانپور: مجمود المطابع، ۱۳۱۹ھ، ص ۷
۵۔ افلاکی، شمس الدین احمد، مناقب العارفین، آگرہ: ستارہ، ۱۸۹۷ء، ص ۵۰
۶۔ ایضاً، ص ۱۵
۷۔ رسالۂ سپہ سالار، ص ۹
۸۔ مناقب العارفین، ص ۱۸
۹۔ صاحب المثنوی، ص ۲۷۳
۱۰۔ مناقب العارفین، ص ۲۰
۱۱۔ ایضاً، ص ۳۶
۱۲۔ ایضاً، ص ۲۲
۱۳۔ ایضاً، ص ۳۹
۱۴۔ رسالہ سپہ سالار، ص ۹۴
۱۵۔ مناقب العارفین، ص ۵۸
۱۶۔ رسالہ سپہ سالار، ص ۹۵
۱۷۔ مناقب العارفین، ص ۶۰
۱۸۔ رومی، محمد جلال الدین، دیوان شمس، تہران: ۱۳۵۷ھ، رباعی ۱۸۹۰
۱۹۔ صاحب المثنوی، ص ۱۴۳
۲۰۔ ایضاً، ص ۵۰
۲۱۔ دیوان شمس، غزل ۳۱۰
۲۲۔ دیوان شمس، غزل ۱۹۹۱
۲۳۔ صاحب المثنوی، ص ۱۷۱
۲۴۔ رسالہ سپہ سالار، ص ۶۸۔۶۹
۲۵۔ مناقب العارفین، ص ۳۸۸

۲۶۔ رسالہ سپہ سالار، ص ۶۹

۲۷۔ دیوان شمس، رباعی ۸۰۵

۲۸۔ مناقب العارفین، ص ۳۹۱

۲۹۔ صاحب المثنوی، ص ۱۸۲

۳۰ مناقب العارفین، ص ۱۰۷

۳۱۔ رومی، محمد جلال الدین، مثنوی معنوی، دفتر اول، قصہ ہدہد و سلیمان علیہ السلام، مرتبہ: قاضی سجاد حسین، دہلی: سب رنگ کتاب گھر، ۱۹۷۶ء، ص ۹۹

۳۲۔ حالی، خواجہ الطاف حسین، حیات سعدی، دہلی: جامعہ لمیٹڈ، ۱۹۹۲ء، ص ۸۰

۳۳۔ مثنوی معنوی، دفتر اول، سرآغاز

۳۴۔ ایضاً، دفتر پنجم، حکایت آن مؤذن

۳۵۔ ایضاً

۳۶۔ ایضاً، دفتر اول، نظر کردن شیر در چاہ

۳۷۔ ایضا

۳۸۔ ایضاً، دفتر اول، ترجیح نہادن شیر جہد را

۳۹۔ ایضاً، دفتر اول، قصہ مری کردن رومیان و چینیان

۴۰۔ دیوان شمس، غزل ۱۴۲۶

۴۱۔ رسالہ سپہ سالار، ص ۹۵

۴۲۔ دیوان شمس، غزل ۱۶۶۱